دعوتِ اقامتِ دین کے وسیع تقاضے

مراحلِ کار اور تجربۂ عمل

(از جناب حکیم حبیب الزمان صاحب صدیقی)

دعوتِ اقامتِ دین کی انقلابی مہم اور اس کے تدریجی مراحل کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ کارِ نبوت سے متعلق ایک جامع تصور پہلے سے ذہن میں موجود ہو۔ اور پھر یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتی مہم کا نقطۂ آغاز کیا تھا، کام کی نوعیت کیا تھی اور کن کن مرحلوں سے آپ کو گذرنا پڑا؛ ان باتوں کا سمجھنا اس لیے ضروری ہے کہ بہت سے لوگ ان اہم اور بنیادی مسائل کو نہ سمجھنے کی وجہ سے دینی انقلاب کے وسعت گیر تقاضوں کو محدود کر دیتے ہیں۔ اور اس غلط اعتقادی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تعمیر و انقلاب کی جدوجہد حیاتِ انسانی کے گوناگوں مسائل سے ہٹ کر کسی ایک ہی گوشۂ زندگی میں سمٹ جاتی ہے ظاہر ہے کہ محدود اور یک جہتی کوشش خواہ کتنی ہی ہنگامہ خیز اور دیدہ بہ جاذبِ نظر کیوں نہ ہو لیکن نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی۔ ہم اگر ملتِ اسلامیہ کے ماضی اور حال کی علمی مساعی اور تعمیر و اصلاح کی جدوجہد کا حقیقت پسندانہ جائزہ لینا چاہیں تو بڑی مشکل سے چند ایسی مثالیں دستیاب ہونگی جن میں فی الواقع کارِ نبوت کی ہمہ گیرانہ حیثیت اور دینی دعوت کے تدریجی مراحل کو ملحوظ رکھا گیا۔ کچھ لوگوں کی جدوجہد صرف مسائل بعد الموت کو حل کرنے کے لیے وقف ہو گئی۔ چند اعتقادی مسائل ہی ان کے فکر و نظر، مناظرانہ موشگافیوں اور باہمی جنگ و جدل کا موضوع بن گئے۔ کچھ دوسروں کو آخرت کے تصور (جو درحقیقت اس کارگہِ حیات میں موثر ترین محرکِ عمل ہے)، نے زندگی کے عملی اور ٹھوس حقائق سے بالکل بیگانہ کر دیا، اور ایک گروہ نے کارِ نبوت کو محض مادی قوت و اقتدار اور حکومت و سیاست سے مخصوص کر دیا۔ یہ سب کچھ دعوتِ نبوی کے منشا و مقصود کو نہ سمجھنے یا مفاد پرستی

کے مہلک اجتماعی مرض کا نتیجہ ہے۔

فطرتِ انسانی کے مطالبے کا دینِ نبوت کی واضح اور جامع تعبیر انسانی فطرت کے حقیقی اور مستقل مطالبات کی تکمیل ہے لیکن یہ حقیقی اور مستقل مطالبات کیا ہیں؟ درحقیقت ان مطالبات کو سمجھے بغیر کارِ نبوت کی نوعیت کا تعین کسی صورت ممکن نہیں ہے اور ان مطالبات کو سمجھنے کے لیے چند امور کو پہلے ذہن نشین کر لینا چاہیے۔ ایک یہ کہ انسان اپنی طبیعت اور فطرت سے ایک ایسی زندگی کا خواہش مند ہے جس کا حال اور مستقبل پُرامن، خوشحال اور مسرت بداماں ہو لیکن عقل و وجدان اور حقائق و تجربات کی روشنی میں یہ بات ناقابلِ انکار ہے کہ پُرامن زندگی اور بے چین زندگی کا تعلق براہِ راست خود انسانی اعمال سے ہے۔ یہ انسان کا کام ہے کہ وہ جس زمین میں رہتا ہے اس کو بدامنی و بے چینی کا جہنم یا امن و خوشحالی کی جنت بنائے۔

دوسرے یہ کہ انسانی اعمال کو دو الگ الگ حصوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا کہ ان کا ایک حصّہ اس زندگی کے لیے مخصوص ہو اور دوسرا بعد الموت کے لیے! بلکہ اعمال جیسے بھی ہوں وہ دنیا اور آخرت میں جزا و سزا کے اعتبار سے ایک ہی قسم کے نتائج پیدا کرتے ہیں۔ جن اعمال کو قرآن حکیم نے اعمالِ صالحہ کہا ہے وہ درحقیقت قوانینِ فطرت سے ہم آہنگی رکھتے ہیں اور ان کے نتائج اسی زندگی سے شروع ہو جاتے ہیں، اور جن اعمال کو اعمالِ سیئہ کہا گیا ہے وہ فطرت کے نقیض ہیں اور ان کے نتائج بھی ہماری اسی زندگی سے ابتدا کرتے ہیں۔ لہٰذا ہمارا ہر عمل ایک دائمی اور مستقل اثر رکھتا ہے جو موجودہ زندگی اور آنے والی زندگی کو یکساں متاثر کرتا ہے، گویا ہماری موجودہ زندگی اور آنے والی زندگی میں گہرا تعلق ہے اور ان دونوں کے ربط و تسلسل کو کسی حال میں نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ جو لوگ جنت یا رضاءِ الٰہی کے لیے محنت و ریاضت کرتے ہیں اگر ان کے اعمال فی الواقع ایسے ہیں جو قرآنی مفہوم کے مطابق عملِ صالح کے تحت آ سکتے ہیں تو ان کا طبعی اور ناگزیر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ آنے والی جنت سے پہلے دنیا میں بھی آزاد، پُرامن اور خوشحال زندگی بسر کرتے ہیں۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (آیہ)

جو نیک کام کرے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اور وہ مومن بھی ہو تو ہم اس کو پاکیزہ زندگی عطا کریں گے اور آخرت میں اس کو اس کے اعمال کی نسبت سے زیادہ اجر دیں گے۔

اور اگر ان کے اعمال اس زندگی میں کوئی بہتر اور خوشگوار نتیجہ نہیں پیدا کرتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اعمال اُس روح سے بالکل خالی ہیں جو ان کی ذات، ماحول اور حیات بعد الموت پر اثر انداز ہونے والی ہوتی ہے۔

قرآن حکیم بار بار اقوام ماضیہ کے حالات میں مکافات عمل کے اصول کی طرف اشارہ کرتا ہے تاکہ ہر شخص یہ سمجھ لے کہ اعمال بد کے نتائج کے لیے صرف آئندہ زندگی ہی کا انتظار ضروری نہیں بلکہ اس زندگی میں بھی ان اعمال کی سزا ملتی ہے، یہ اس لیے کہ ان اعمال کی طبیعت اور فطرت ہی ایسی ہے کہ اسی زندگی سے ان کے نتائج شروع ہو جاتے ہیں لیکن اکثر لوگ قرآن حکیم کے لفظ "الآخرہ" سے اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ اس زندگی کے اعمال کے نتائج صرف قیامت ہی کو ظاہر ہوں گے۔ حالانکہ الآخرہ کا لفظ قرآن حکیم میں نتائج اعمال یا مکافات عمل کے معنوں میں استعمال ہوا ہے جو اس زندگی کو بھی شامل ہے۔ چنانچہ مفسرین نے بھی اسی خیال کو ترجیح دی ہے۔

وحمل الآخرة على ظاهرها من خيرى الدنيا والآخرة اولى

الآخرہ کو اس کے ظاہری مفہوم یعنی دنیا و آخرت پر محمول کرنا زیادہ بہتر ہے۔ (تفسیر خازن)

رہی یہ بات کہ ہمیں یہ کیسے معلوم ہو کہ یہ اعمال اچھے ہیں اور یہ بُرے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کے لیے صرف حضرات انبیاء علیہم السلام کے لائے ہوئے دینِ فطرت ہی کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ یہ صرف دینِ قیم ہی کا کام ہے کہ وہ انسان کو خیر و شر کی قدروں سے متعارف کرتا اور اس کو نیک و بد کی تمیز کا ملکہ عطا کرتا ہے۔

تیسرے یہ کہ جس طرح موجودہ زندگی اور آئندہ زندگی میں باہم ربط و تعلق ہے اسی طرح انسان

کے جسم و روح میں بھی گہرا رشتہ ہے اور ان دونوں کا باہم تعاون زندگی کو صحیح راہ پر چلا سکتا ہے۔ جو چیزیں جسم کو درکار ہیں وہ اس کے لیے مہیا ہوں اور جو روح کے لیے ضروری ہیں وہ اس کے لیے موجود ہوں۔ اگر ایک کے لیے سب کچھ ہو اور دوسرے کو بالکل محروم چھوڑ دیا جائے تو اس سے نہ صرف افراد و اشخاص پر بلکہ جماعات اور اس سے بھی بڑھ کر نظام کائنات پر تباہ کن اثر پڑتا ہے۔

ان تصریحات سے بآسانی سمجھا جا سکتا ہے کہ انسانی فطرت پوری زندگی میں اعتدال و توازن چاہتی ہے اور اس کے نتیجہ کے طور پر مستقل اور جاودانی مسرت و خوشحالی کی خواہشمند ہے یعنی صرف موجودہ زندگی کی مسرت ہی نہیں بلکہ حیات بعد الموت کی مسرت بھی چاہتی ہے اور اس مقصد کے لیے فطرت کا اولین مطالبہ یہ ہے کہ انسان کے تمام اعمال متوازن ہوں۔ گویا فطرت زندگی کے کسی شعبہ میں خواہ وہ فکر و ذہن سے متعلق ہو یا عمل و کردار سے، کجی، ناہمواری اور بے اعتدالی کو ہرگز برداشت نہیں کرتی بلکہ وہ سراسر اعتدال اور مکمل توازن کی متقاضی ہے اور فطرت کا ہمہ گیر قانون یہ ہے کہ انسان اپنی زندگی کے تمام شعبوں، تہذیب و ثقافت، اخلاق و معاشرت، سیاست و معیشت، بین الملی تعلقات اور تمام شخصی و اجتماعی اعمال میں اعتدال و توازن قائم کرنے سے ہی اس زندگی اور آنے والی زندگی کو آلام و مصائب اور بدامنی و بے چینی سے بچا سکتا ہے۔

کائنات کا جامع اور ہمہ جہتی تصور: کائنات عالم انقلاب و تغیر کی آماجگاہ ہے۔ انسانی جماعتوں کا بننا اور بگڑنا ایک محسوس اور مشہود حقیقت ہے اور انسانی تاریخ کا کوئی دور اس کی نمود سے خالی نہیں رہا۔ آج جو قوم بن رہی ہے کل تک اس کو بہر حال بگڑنا ہے لیکن اس کا بگاڑ بھی کسی نئی تعمیر کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ فطرت ہر لمحہ اسی اُدھیڑ بُن میں لگی رہتی ہے لیکن یہ محض مشقِ ستم کے طور پر نہیں بلکہ ایک بلند تر مقصد کے لیے ہے۔ فطرت اگر کسی چیز کی تخریب چاہتی ہے تو اس لیے نہیں کہ وہ بگاڑ کو پسند کرتی ہے بلکہ اس لیے کہ وہ کائنات کو بنانا اور سنوارنا چاہتی ہے اور اس تعمیری مقصد کی خاطر وہ ہر قسم کی تخریب کے لیے آمادہ رہتی ہے۔

بہر یک گل خونِ صد گلشن کند

نسیم صبح اگر ایک طرف پھول کے شیرازہ کو بکھیرتی ہے تو دوسری طرف غنچۂ گل کو نکھارتی اور اس کی شیرازہ بندی بھی کرتی ہے۔ اور اس کی چابک دستی اور ہمہ بینی بھی غضب کی ہے کہ ایک ساتھ ہی دونوں کام انجام دے رہی ہوتی ہے۔ ع

از نسیم گل پریشاں غنچہ خنداں مے شود

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بناؤ اور بگاڑ کا عمل ایک طے شدہ اسکیم کے ماتحت ہر لحظہ جاری رہتا ہے اور کارگہِ حیات میں اسی چیز کو زندہ رہنے کی اجازت ملتی ہے جس میں زندہ رہنے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ بالفاظ دیگر وہ فطرت کے تقاضوں کو پورا کر رہی ہوتی ہے اور جو چیز فطرت کے مطالبات تسلیم کرنے سے گریز کرتی ہے اس کو اس حالت میں باقی رکھنا فطرت کے مقاصد کے سراسر منافی ہے۔ اور اس حالت میں اس کے لیے دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اپنی روش میں تبدیلی پیدا کر کے اپنے آپ کو زندہ رہنے کے قابل بنائے اور دوسری صورت یہ ہے کہ وہ اپنے وجود کو فنا و عدم کے حوالے کر دے۔ فطرت کا اٹل قانون ان دو صورتوں کے علاوہ کسی تیسری صورت کو ہرگز برداشت نہیں کرتا۔

انسانی جماعات بھی فطرت کے اس ہمہ گیر قانون سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ یہاں بھی وہ بہتر سے بہتر انسانوں کو چھانٹنی اور اصلح و انفع کی طلب و جستجو میں مصروف کار رہتی ہے۔ اور جب کوئی جماعت فطرت کے اعلیٰ اصولوں سے منحرف ہو کر فساد کی راہ پہ گامزن ہو جاتی ہے اور اس کے اس انحراف و بغاوت سے اس کا جوہر انسانیت زنگ آلود ہو کر اپنی حقیقی قدر و قیمت کھو بیٹھتا ہے تو اس حالت میں خالقِ کائنات کی طرف سے اس زنگ خوردہ جوہر کو جلا دینے کے لیے نبوت و وحی کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہنا چاہیے کہ جب کسی قوم میں خدا پرستی کی روح مُردہ ہو جاتی ہے اور اس کی وجہ سے اس کی زندگی کا شیرازہ بکھر جاتا ہے تو اس وقت خدا کے پیغمبر اس قوم میں مبعوث ہوتے ہیں اور وہ اس قوم میں از سر نو خدا پرستی کی روح پیدا کر کے اس کے اجزاءِ زندگی کی شیرازہ بندی کرتے ہیں۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (الحدید)

بلاشبہ ہم نے اپنے رسولوں کو دلائل بینات کے ساتھ بھیجا اور ان کے ہمراہ کتاب اور میزان اتاری تاکہ لوگ نقطۂ اعتدال پر کھڑے ہو جائیں۔

حضرات انبیاء علیہم السلام کی بعثت قوموں کے شعور فہمی کو بیدار کرنے اور ان کی اصلاح و تعمیر کی آخری کوشش ہوتی ہے اور جب کوئی قوم نبی کی دعوت کو قبول کر کے اصلاح حال کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے تو اس کے لیے زندگی کی تمام راہیں کھول دی جاتی ہیں اور اگر وہ انکار و انحراف کی راہ اختیار کرتی ہے تو اتمام حجت کے بعد قدرت اس کو مختلف آزمائشوں مثلاً قحط سالی، فقر و فاقہ، تباہ کن وبا اور باہم قتل و خوں ریزی سے سرزنش کرتی ہے کہ شاید یہ رنج و مصیبت ہی اس کو راہِ حق کی طرف متوجہ کر سکے۔ لیکن جب اس انتباہ کے بعد بھی وہ اپنے اندر کوئی تبدیلی نہیں پیدا کرتی تو پھر قدرت اس کو ایک عرصہ تک بے لگام چھوڑ دیتی ہے تاکہ اس کی غلط کاریوں اور معصیت کوشیوں میں جو کمی رہ گئی ہے وہ بھی پوری ہو جائے اور ٹھیک ٹھیک وہ حالت پیدا ہو جائے جو کسی قوم کی مکمل تباہی کے اسباب فراہم کرتی ہے اور پھر یک لخت ہی اس کے ناپاک وجود سے زمین کو پاک کر دیا جاتا ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا اِلٰى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ، فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ ـ فَلَوْلَآ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ـ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ حَتّٰٓى اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ـ (الانعام)

ہم نے آپ سے پہلی اُمتوں کی طرف رسول بھیجے (ان کے انکار پر) ہم نے ان کو تنگی معیشت اور مرض کے ساتھ پکڑا تاکہ وہ عاجزی اختیار کریں، پس کیوں نہ عاجزی اختیار کی انہوں نے جب کہ آیا ان پر ہمارا عذاب۔ لیکن (بات یہ ہے) کہ ان کے دل سخت ہو چکے تھے اور شیطان نے ان کے اعمال کو ان کی نظروں میں خوبصورت بنا دیا تھا۔ پس جب وہ اس چیز کو بھول گئے جس سے ان کو نصیحت کی گئی تھی تو ہم نے ان پر

ہر چیز کے دروازے کھول دیئے، یہاں تک کہ جب وہ اِترانے

لگے تو ہم نے ان کو ناگہاں پکڑ لیا، پس وہ مایوس ہو گئے۔

سطورِ بالا سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ قوموں کی اصلاح اور دعوت و اقامتِ دین کا کام صرف حضرات انبیاء ہی کے لیے مخصوص ہے اور نبی کے سوا کوئی دوسرا شخص یا گروہ یہ کام کرنے کا مجاز ہی نہیں ہے۔ شاید اس بات سے کسی کو انکار نہیں ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام خدا کی طرف سے مبعوث ہوتے ہیں اور وہ براہِ راست خدا کی باتیں اس کے بندوں تک پہنچاتے ہیں۔ جو لوگ نبی کی زندگی میں دعوتِ حق کو قبول کر کے جان و مال سے اس کی حمایت و تائید کرتے ہیں، نبی کے اُٹھ جانے کے بعد وہ نبی کے جانشین ہوتے ہیں اور نبی کا کام اب ان کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور پھر ان پیروانِ دعوتِ نبوی کے ذریعے جو لوگ دینِ حق کو قبول کرتے ہیں ان پر یہ گراں بار ذمہ داری عائد ہو جاتی ہے، وھلم جرًّا۔ یعنی یہ ضروری ہے کہ ہر زمانہ میں ایک ایسا گروہ موجود رہے جو مخلوقِ خدا کو خدا پرستی کی دعوت دے اور احیاء و اقامتِ دین کی جدوجہد کرے۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ - (آیہ)	تم میں ایک ایسا گروہ موجود ہونا چاہیے جو لوگوں کو بھلائی کی طرف بلائے، نیکی کا حکم دے اور بدی سے روکے۔

اس بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا واضح ارشاد یہ ہے:

لا تزال من امتی امۃ یقاتلون علی الحق۔ (رواہ ابوداؤد)	میری اُمت میں ہمیشہ ایک ایسا گروہ رہے گا جو حق کے لیے جہاد کرتا رہے گا۔

نیز یہ بات بھی خوب سمجھ لی جائے ــــ اس لیے کہ آج اس کی بیحد ضرورت ہے ــــ کہ جس طرح حضرات انبیاء علیہم السلام کی دعوت کا انکار کرنے والے لوگ عذابِ[1] الٰہی کے مستوجب بنتے ہیں اسی طرح اس

---

[1] رسول جب آتا ہے تو اپنی قوم کے لیے ایک فیصلہ کن عدالت بن کر آتا ہے اور وہ اللہ کے دیئے ہوئے علم کے تحت پورے وثوق سے عذاب کے بارے میں تنبیہ کرتا ہے۔ مگر رسول کے سوا دوسرے مصلحین و مجددین ربانی (باقی ۱۹ پر)

فریضۂ دینی کو انجام دینے والے طائفۂ احرار کی سعی اقامتِ دین کے مخالفین اور فسق و معصیت میں ڈوبے ہوئے مجرمین بھی اللہ کی گرفت سے نہیں بچتے۔ بلکہ اکثر و بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ اہلِ معصیت کے ساتھ وہ لوگ بھی عذابِ الٰہی کی زد میں آجاتے ہیں جو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی مشکلات سے گھبرا کر گوشۂ تنہائی اختیار کر لیتے ہیں اور صرف پیروانِ دعوتِ حق اور اربابِ عزیمت ہی اس عذاب سے محفوظ رہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ملتِ اسرائیل کے ایک ایسے ہی واقعہ کو بطورِ مثال پیش کر دینا کافی ہوگا۔

وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمًا ۙ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ۭ قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖٓ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْۗءِ وَاَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍۢ بَـــِٕيْسٍۢ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۔

(الاعراف - ۲۱)

جب بنی اسرائیل کے ایک گروہ نے دوسرے گروہ کو کہا تم ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو جن کو اللہ تعالیٰ ہلاک کرنے والے یا عذاب میں مبتلا کرنے والے ہیں۔ دوسرے گروہ (اہلِ عزیمت) نے کہا تمہارے رب کے سامنے عذر پیش کرنے کے لیے اور اس لیے بھی کہ شاید یہ لوگ بچ جائیں پس جب وہ لوگ تعلیم خدا کو بھول گئے تو ہم نے برائی سے روکنے والے اہلِ حق ہی کو نجات دی اور باقی تمام ظالموں کو خطرناک عذاب کے ذریعہ پکڑ لیا۔ اس لیے کہ وہ نافرمان تھے۔

گذشتہ بحث سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ بعثتِ انبیاء کا مقصد انسانی فطرت کے حقیقی تقاضوں کی تکمیل ہے اور یہ بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ انسانی فطرت کے تقاضے کسی ایک ہی شعبۂ زندگی کی تکمیل سے پورے نہیں ہوتے بلکہ تمام شعبہ ہائے زندگی کی تکمیل سے پورے ہوتے ہیں اس لیے پیغمبرانہ دعوت زندگی کی کسی ایک ہی سمت میں نہیں بلکہ فکر و عمل کے ہر پہلو کی طرف رُخ کرتی، حیاتِ انسانی کے منتشر اور پراگندہ اجزاء میں ربط و نظم پیدا کرتی اور مستقل اقدارِ حیات کی اساس پر از سرِ نو زندگی کی تعمیر کرتی ہے۔

(بقیہ حاشیہ صلا) کا معاملہ مختلف ہے۔ وہ اقامتِ دین کا کام جس درجے کے کمال کے ساتھ انجام دیتے ہیں اور جس درجے میں قوم پر اتمامِ حجت کر جاتے ہیں اس کے مطابق نتائج برآمد ہوتے ہیں اصولاً یہ بات صحیح ہے کہ حق کو ٹھکرانے والی قوم کے لیے

دعوتِ نبوی کا دورِ اوّل | کارِ نبوت کے عام تصور کو جاننے کے بعد اب یہ دیکھنا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ جدوجہد سے چھٹی صدی میں جو آفاق گیر انقلاب رونما ہوا اس کا اسلوبِ کار کیا تھا اور آنحضرت صلعم کو اس کی تکمیل میں کن کن مراحل سے گذرنا پڑا تھا، نیز یہ کہ اس انقلاب کی نوعیت کیا تھی؟

پیغمبرانہ دعوت کا پہلا کام یہ ہے کہ وہ قلب و نظر کی پراگندگی کو سلجھا کر اس کو علم و یقین سے آراستہ کرتی ہے، یعنی پہلے مرحلہ پر وہ انسانی ذہن کو باطل تصوراتِ زندگی سے پاک کر کے اس کو ایک پاکیزہ اور بلند تر مقصد سے روشناس کرتی اور پھر اس مقصد کے لیے اتنی گہری عقیدت و محبت اور غیر متزلزل یقین پیدا کرتی ہے کہ وہ مقصد پوری زندگی پر حاوی ہو جاتا ہے اور زندگی کی ہر خواہش اس کے آگے سرنگوں ہو جاتی ہے۔ درحقیقت یہ جذبۂ دروں، صدق و اخلاص اور سوز و دروں ہی پیغمبرانہ دعوت کا پہلا ثمرہ ہے اور جب تک یہ پیدا نہ ہو انسان کے لیے اس دشتِ جنون میں قدم رکھنا ممکن ہی نہیں ہے۔

نازپروردِ تنعم نبرد راہ بدوست عاشقی شیوۂ رندانِ بلاکش باشد

یہ جذب و شوق کا وہ مقام ہے جہاں متاعِ جان محبوب کے قدموں پر نثار کرنے ہی سے سکونِ قلب میسر آتا ہے اور جو اس راہ میں قدم رکھتا ہے اس کو اندیشۂ سود و زیاں سے بے نیاز ہو کر اپنا سب کچھ لٹا دینے کا عہد کرنا پڑتا ہے۔

دل دادم و جاں دادم ایماں دادم سوداست دے سودی دارم چیست

یہ حقیقت ہے کہ جب تک دل میں جذبۂ شوق اور ولولۂ عشق پیدا نہ ہو اس وقت تک انسان اپنے مقصد کی خاطر ایثار و قربانی کے لیے آمادہ نہیں ہوتا اور نہ اس میں صبر و ضبط کی توفیق فروغ پاتی ہیں لیکن یہ جذبۂ شوق محض کتاب خوانی اور بے جان نقوش سے ہرگز پیدا نہیں ہوتا۔ مکتب کا کام صرف اتنا ہی ہے کہ انسانی دماغ کو ایک خاص سانچے میں ڈھال دے۔ گو یہ کام بھی اپنی جگہ کار آمد ہے مگر حصولِ مقصد کے لیے کافی نہیں ہے۔ اس کے لیے تو ضروری ہے کہ آپ جس چیز

کو حاصل کرنا چاہتے ہیں آپ کے دل میں اس کے لیے گہری محبت، غیر متزلزل عزم اور غیر فانی جذبۂ شوق ہو اور یہ چیز علمِ فلاطوں سے نہیں بلکہ جذبِ دروں اور سوز و درد سے حاصل ہوتی ہے ؎

یک ذرۂ دردِ دل از علمِ فلاطوں بہ

بلکہ کتاب اللہ کے تفسیری نکات و رموز بھی مسائلِ حیات کی گرہ کشائی کے لیے کافی نہیں ہیں تاوقتیکہ کتاب کا حیات بخش پیغام دل کی عمیق گہرائیوں میں اُتر نہ جائے ؎

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف

حضرات صحابہ کا یہ قول کس قدر پُر مغز اور حقیقت افروز ہے ؟

تعلمنا الایمان ثم تعلمنا القرآن ہم نے پہلے ایمان حاصل کیا، پھر قرآن پڑھا

آیئے اب دیکھیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے مرحلہ پر کس طرز سے کام شروع کیا :

سمندر کے تہ نشین ذروں میں کہیں کہیں چمکدار موتی بھی موجود ہوتے ہیں لیکن ان کو حاصل کرنا ہر شخص کا کام نہیں ہے۔ یہ غواص ہی کا کام ہے کہ سمندر کی تہ میں پہنچ کر قیمتی جواہر کو باہر نکال لائے۔ اسی طرح انسانی بستیوں کی تاریک فضا میں کچھ جوہر قابل بھی ہوتے ہیں جو معمولی صیقل گری سے ماہ و خورشید بن کر چمکنے لگتے ہیں لیکن ان کا انتخاب غواصِ فطرت یعنی ذاتِ نبوت کے سوا ممکن نہیں ہے۔

ایک داعی جب پہلے پہل کام کی ابتدا کرتا ہے تو قدرتی طور پر اس کی نگاہ ایسے اشخاص کی طرف اُٹھتی ہے جو افکار و خیالات کے لحاظ سے دعوت کے مزاج سے کچھ نہ کچھ مطابقت رکھتے ہیں اور داعی کو ان کی نسبت پہلے سے علم ہوتا ہے کہ ان میں قبولِ دعوت کی استعداد موجود ہے۔ اس نفسیاتی احساس ہی کی بنا پر آنحضرت صلعم نے سب سے پہلے مکہ کی بھرپور آبادی میں سے چند اشخاص کو اس قابل سمجھا کہ ان کو اپنی نئی دعوت سے روشناس کریں۔ کسی گذشتہ بحث میں یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ عرب کی سرزمین میں کم و بیش ایسے لوگ موجود تھے جو ملتِ ابراہیمی کے بنیادی عقیدہ یعنی توحید پر قائم تھے۔ لیکن چونکہ صدیوں سے ان میں کسی نبی کا ظہور نہ ہوا تھا اس لیے وہ اس دین کی نسبت بہت محدود اور اجمالی علم رکھتے تھے اور وہ کسی داعیٔ برحق کے ظہور کے منتظر تھے۔ آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے مرحلہ پر ایسے ہی لوگوں کو اپنے قریب لانے کی کوشش فرمائی۔ چنانچہ سب سے پہلے اسلام لانے والے صحابہ میں جن حضرات کے نام اربابِ تاریخ و سیر نے قلمبند کیے ہیں ان میں یہ وصف مشترک تھا کہ وہ کسی نہ کسی حیثیت سے دعوتِ اسلامی کے ساتھ مناسبت رکھتے تھے۔ ابنِ اسحاق نے ان حضرات کے اسمائے گرامی تفصیل سے ذکر کیے ہیں۔ ابونعیم نے دلائل النبوہ میں اس موضوع پر ایک طویل باب قلمبند کیا ہے۔ نیز اصابہ فی احوال الصحابہ اور دیگر کتب سیر میں ان حضرات کی نسبت تفصیلی بحث ملتی ہے۔ ان میں کچھ تعداد ان لوگوں کی ہے جو نبوت سے پہلے آپ سے کسی نہ کسی طرح کا تعلق رکھتے تھے اور ان کو آپ کی پاکیزہ سیرت اور بلند کردار کا تجربہ ہو چکا تھا۔ مثلاً حضرت خدیجہؓ آپ کی زوجۂ محترمہ تھیں، حضرت علیؓ آپ کے تربیت یافتہ تھے، حضرت ابوبکر صدیقؓ آپ کے مخلص دوست تھے اور حضرت زیدؓ آپ کے غلام تھے، سب سے پہلے ان حضرات ہی نے اسلام قبول کیا۔ اور کچھ تعداد اُن لوگوں کی تھی جو پہلے سے حق کے متلاشی تھے۔ مثلاً عثمانؓ بن مظعون اسلام لانے سے پہلے ہی خدا پرست تھے اور شراب چھوڑ چکے تھے، حضرت ابوذر غفاری جن کا اسلام لانے والوں میں چھٹا یا ساتواں نمبر ہے اسلام لانے سے پہلے بت پرستی ترک کر چکے تھے اور ایک خدا کی عبادت کرتے تھے۔ صہیبؓ، عبداللہ بن جدعان کے زیر تربیت رہ چکے تھے، جو اسلام سے پہلے وفات پا چکے تھے اور انہوں نے اپنی صوابدید سے مے نوشی ترک کر دی تھی۔ سعیدؓ اپنے والد زید کی صحبت میں رہ چکے تھے اور زید نے دینِ ابراہیمی کی تلاش میں شام کا سفر کیا تھا اور وہاں یہودی و عیسائی علماء و مشائخ سے ملے تھے لیکن ان کو کسی سے اطمینانِ قلب نہ ہو سکا تھا۔ حضرت اسماء بنت ابی بکر روایت کرتی ہیں کہ میں نے زید کو اس حال میں دیکھا کہ کعبہ سے پیٹھ لگائے ہوئے تھے اور لوگوں سے کہہ رہے تھے "اے قریش تم میں سے کوئی شخص بجز میرے ابراہیمؑ کے دین پر نہیں ہے"۔ (بخاری)

اِس ابتدائی دور میں دعوت کا کام مخفی طور پر انجام پاتا رہا اور جن لوگوں میں قبولِ حق کی استعداد تھی وہ خود ہی بارگاہِ رسالت میں کھچے چلے آتے تھے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہِ ایمانی ان کے دلوں میں رعشۂ سیماب اور بجلی کی سی تڑپ پیدا کر دیتی تھی، جو ایک دفعہ حلقہ بگوش

رسالت ہوجاتا تو دنیا بھر کی اذیتیں اور طعنے اور تحریص و ترغیب کے تمام اسباب و وسائل اس کے قدم میں لغزش پیدا نہ کر سکتے تھے۔

دعوتِ اسلامی کا دورِ اوّل سالکانِ راہِ حریت و تشنگانِ بادۂ احدیت کے لیے سخت صبر آزما تھا۔ قریش نے ان کی ایذا رسانی کے لیے نئے نئے طریقے ایجاد کیے اور بے یار و مددگار مسلمانوں پر اتنا تشدد کیا کہ جبر و تشدد کی پوری تاریخ اس کے سامنے ہمیشہ شرمسار رہے گی۔ کسی کو دوپہر کی شعلہ بار دھوپ میں تپتی ہوئی ریت پر لٹا کر اس کے سینہ پر بھاری پتھر رکھ دیا جاتا، کسی کو دہکتے ہوئے کوئلوں پر لٹا کر اس کی چھاتی پر پاؤں رکھ دیے جاتے، کسی کو جلتی ہوئی زمین پر لٹا کر اس قدر پیٹا جاتا کہ وہ بیہوش ہوجاتا، کسی کو رسّی سے باندھ کر گلی کوچوں میں گھسیٹا جاتا اور کچھ ان میں ایسے جانباز بھی تھے جنہوں نے سفاک دشمن کے ہاتھ سے یہ کہتے ہوئے جامِ شہادت نوش کیا۔

جان اپنی نثار کر ڈالی　　یہی لے دے کے ایک کام کیا

یہ داستانِ جور و ستم بہت طویل ہے لیکن چند حرف آپ ان اسیرانِ بلا ہی کی زبانی سن لیجیے۔

قَالَ عُتْبَةُ ابْنُ غَزْوَانَ لَقَدْ رَأَيْتُنِي وَإِنِّي سَابِعُ سَبْعَةٍ مَعَ رَسُولِ اللّٰهِ صلی اللّٰه علیه وسلم مَا لَنَا طَعَامٌ الا وَرَقَ الشَّجَرَةِ حَتّٰى تَقَرَّحَتْ أَشْدَاقُنَا فَالْتَقَطْتُ بُرْدَةً فَقَسَمْتُهَا بَيْنِي وَبَيْنَ سَعْدٍ فَمَا مِنَّا مِنْ أُولٰئِكَ السَّبْعَةِ إِلَّا وَهُوَ أَمِيرُ مِصْرٍ مِنَ الْأَمْصَارِ وَسَتُجَرِّبُونَ الْأُمَرَاءَ بَعْدَنَا۔

(اخرجه الترمذی فی الشمائل)

عتبہ بن غزوان کہتے ہیں میں نے اپنے آپ کو اس حالت میں دیکھا اس وقت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ ساتواں مسلمان تھا، کہ ہمارے پاس درختوں کے پتّوں کے سوا کھانے کی کوئی چیز نہ تھی، یہاں تک کہ ہمارے جبڑے زخمی ہوگئے تھے، پس میں نے ایک چادر پائی، اور اس کو اپنے اور سعد میں تقسیم کیا۔ لیکن اب ان سات مسلمانوں میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جو کسی مصر کا حاکم نہ ہو اور ہمارے بعد آنیوالے امراء کا تم جلد ہی تجربہ کروگے۔

حضرت خبابؓ نے آنحضرت صلعم کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کی، یا رسول اللہ کفار کے

جبر و تشدد کی انتہا ہو چکی ہے۔ آپ نے جس نصرتِ الٰہی کا ہم سے وعدہ فرمایا تھا وہ کب آئیگی؟ اِس مظلوم مسلمان کی مضطربانہ فریاد سے آنحضرت صلعم کو یقیناً رنج ہوا ہوگا لیکن اس کا جواب اس کے سوا کیا ہو سکتا تھا جو آپ نے اس موقع پر دیا:

قَالَ كَانَ الرَّجُلُ فِيمَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ يُحْفَرُ لَهُ الْأَرْضُ فَيُجْعَلُ فِيهِ فَيُجَاءُ بِالْمِنْشَارِ فَيُوضَعُ عَلَى رَأْسِهِ فَيُشَقُّ وَمَا يَصُدُّهُ ذَالِكَ عَنْ دِينِهِ وَيُمْشَطُ بِأَمْشَاطِ الْحَدِيدِ مَا دُونَ لَحْمِهِ مِنْ عَظْمٍ وَعَصَبٍ وَمَا يَصُدُّهُ ذَالِكَ عَنْ دِينِهِ۔ وَاللّٰهِ لَيَتِمَّنَّ هٰذَا الْأَمْرُ حَتّٰى يَسِيرُ الرَّاكِبُ مِنْ صَنْعَاءَ إِلَى حَضْرَمَوْتَ لَا يَخَافُ إِلَّا اللّٰهَ وَلٰكِنَّكُمْ تَسْتَعْجِلُونَ۔ (اخرجہ البخاری)

فرمایا تم سے پہلے ایسے لوگ ہو گذرے ہیں کہ زمین میں گڑھا کھود کر ان کو اس گڑھے میں گاڑ دیا جاتا اور پھر ان کے سر پر آرا رکھ کر ان کو چیر دیا جاتا تھا لیکن یہ آزمائش ان کو راہِ حق سے پھیر نہ سکتی تھی۔ ان کے جسم میں لوہے کی کنگھی کے دندانے اس طرح چبھوئے جاتے تھے کہ وہ گوشت سے نیچے اتر کر ہڈیوں اور پٹھوں میں دھنس جاتے تھے لیکن یہ مصیبت بھی ان کو حق سے نہ ہٹا سکتی تھی۔ خدا کی قسم اسلام غالب ہو کر رہے گا یہاں تک کہ سوار صنعا سے حضر موت تک تنہا چلا جائیگا اور اس کو اللہ کے سوا کسی کا خوف نہ ہوگا۔ لیکن تم تو جلد بازی کرتے ہو۔

اس موقع پر یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ اِس ابتدائی دور میں اسلام قبول کرنے والوں میں بہت زیادہ تعداد ان لوگوں کی ہے جو زر و مال اور منصب و جاہ سے محروم تھے۔ لیکن یہ کوئی نئی بات نہ تھی بلکہ آویزشِ حق و باطل کی پوری تاریخ میں سب سے زیادہ نمایاں حقیقت یہی ہے کہ دعوتِ حق کے مخالفین کی صفِ اول میں جگہ پانے والے اور اہلِ حق پر تا خیرۂ حیات تنگ کرنے والے وہی لوگ ہوتے ہیں جن کو سوسائٹی میں سیاسی اقتدار یا مذہبی پیشوائی کا مقام حاصل ہوتا ہے۔ اور یا وہ اصحابِ دولت و ثروت ہوتے ہیں جن کو اپنی وجاہت اور زر و مال کے ضیاع و نقصان کی فکر ہوتی ہے۔ قرآن حکیم نے جن داعیانِ حق کا ذکر کیا ہے ان کو ان جاہ پرست اور خود غرض دنیا دار لیڈروں ہی سے سابقہ پڑا۔ ان لوگوں نے ہمیشہ اپنے چند روزہ جھوٹے اقتدار کے لیے انسانیت

وشرافت کو رسوا کیا اور انسانی تاریخ کا کوئی صفحہ ملوک وسلاطین اور علماء سوء کی سیاہ کاریوں، اور دین فروشیوں سے خالی نہیں ہے۔ مجھے یہ کہنے دیجیے کہ ملوک وسلاطین سے بھی بڑھ چڑھ کر جو لوگ دعوت حق کی مزاحمت اور اہل حق کی تذلیل کرتے رہے ہیں وہ اہل اقتدار کے حاشیہ بردار اور جاہ پرست علماء و مشائخ ہیں جن کی کمینہ سازشوں نے ہمیشہ داعیان حق کو رنج و بلا اور قید و بند کی صعوبتوں میں مبتلا رکھا۔ یہی لوگ تھے جنہوں نے امام احمد بن حنبلؒ، امام اعظمؒ، حجتہ الاسلام احمد بن تیمیہ اور حضرت مجدد الف ثانیؒ ایسے حق پرستوں کو عمر بھر چین نہ لینے دیا اور حکام وقت سے ساز باز کر کے ان کو قید و بند میں ڈلوایا، حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنے زمانہ میں سب سے زیادہ انہی لوگوں کی سیاہ کاریوں کا ماتم کیا اور ان کی سنگ دلی، قساوت قلبی اور دین فروشی پر بار بار ان کو ملامت کرتے رہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:۔

"اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ آسمان کی بادشاہت لوگوں پر بند کرتے ہو۔ نہ خود اس میں داخل ہوتے ہو اور نہ دوسروں کو داخل ہونے دیتے ہو"

"اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے، تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کی مانند ہو جو اوپر سے خوبصورت دکھائی دیتی ہیں مگر اندر مردوں کی ہڈیوں اور نجاست سے بھری پڑی ہیں، تم بظاہر لوگوں کو راست باز دکھائی دیتے ہو مگر باطن میں ریاکاری اور بے دینی سے بھرے ہوئے ہو"

"اے اندھے رہنماؤ! تم مچھر کو تو چھانتے ہو اور اونٹ کو نگل جاتے ہو" (انجیل متی)

اور یہ بات کس قدر اندوہناک ہے کہ بالآخر ان حاملان شریعت کی ناپاک سازشوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کو مجرموں کے کٹہرے میں لا کھڑا کیا۔

"پھر ان کی ساری جماعت اٹھ کر اسے پیلاطس رومی حکمران کے پاس لے گئی اور انہوں نے الزام لگانا شروع کیا کہ اسے ہم نے اپنی قوم کو بہکاتے اور قیصر کو خراج دینے سے منع کرتے اور اپنے آپ کو مسیح بادشاہ کہتے پایا۔ پیلاطس نے سردار

کاہنوں اور عام لوگوں سے کہا، میں اس شخص میں کوئی قصور نہیں پاتا مگر وہ اور بھی زور دے کر کہنے لگے کہ یہ تمام یہودیہ میں بلکہ گلیل سے لے کر یہاں تک لوگوں کو سکھا سکھا کر اُبھارتا ہے اور چلّا چلّا کر مصر ہوتے رہے کہ اسے صلیب دی جائے اور ان کا چلّانا کارگر ہوا۔" لوقا ۲۳ : ۱-۲۳

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دعوتِ دینی کی ابتدا فرمائی تو اس وقت بھی سب سے زیادہ جن لوگوں نے آپ کی مخالفت میں حصہ لیا وہ مکہ کے اربابِ اقتدار اور مذہبی پیشوا ہی تھے۔ سردارانِ قریش ایک طرف مکہ کی شہری مملکت کے اعضاءِ حکومت یا رؤسائے اعظم تھے اور دوسری طرف عرب کی دینی امامت وپیشوائی کے مدعی تھے۔ مملکتِ مکہ کے مناصب حکومت کی فہرست کے ضمن میں جن لوگوں کے نام درج ہیں ان میں صرف ایک ہی گرامی قدر شخصیت تھی جس نے دعوت کے پہلے مرحلہ پر ہی آنحضرت صلعم کی آواز پر لبیک کہی۔ یہ شخصیت حضرت ابوبکر صدیقؓ کی ہے جو اسلام لانے سے پہلے مکہ اسٹیٹ کے شعبۂ مغارم ودیات کے مختارِ اعلیٰ تھے۔ اور دوسرے درجہ میں حضرت عمرؓ ہیں جو ۶ سنہ نبوی میں حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے، اور اسلام سے پہلے شعبۂ سفارت ومنافرت کے اختیارات ان کے سپرد تھے اور پھر حضرت عباسؓ ہیں جو دعوت کے تیسرے دور میں مسلمان ہوئے اور بعثتِ نبوی کے وقت منصب سقایہ پر فائز تھے۔ ان حضرات کے علاوہ جتنے اربابِ حکومت واقتدار اور شہر کے رؤسائے اعظم تھے وہ آخر دم تک دعوتِ اقامتِ دین کی مخالفت میں سرگرم کار رہے۔

تیسرے دور میں یہود ونصاریٰ کے علماء ومشائخ یہودی سرمایہ دار اور ایران وروما کی امپیریلسٹ طاقتیں اسلام کے لیے مستقل خطرہ بنی رہیں۔ لیکن زمانۂ خلافتِ راشدہ کے بعد ایرانی ورومی امپیریلزم اور یہود ونصاریٰ کے احبار ورہبان کی جگہ خود امتِ مسلمہ کے ملوک وسلاطین اور علماء ومشائخ نے پُر کردی اور اسلامی تاریخ کے ہر دور میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اصحابِ تجدید دین اور علمبردارانِ دعوتِ حق کے مقابلہ میں یہی لوگ ہمیشہ برسرِ پیکار رہے ہیں۔ اسلام کے مایۂ صد فخر محدث حضرت عبداللہ بن مبارک نے ایک ہی شعر میں پوری بات کہدی ہے ؎

وھل افسد الدین الا الملوك واحبار سوء ورھبانھا

اور کیوں نہ واشگاف الفاظ میں کہدیا جائے کہ آج بھی یہی وہ طبقے ہیں جو نہ صرف تحریک دعوت و اقامت دین کی مخالفت میں پیش پیش ہیں، بلکہ انہوں نے اسلام کی آڑ میں اسلام ہی کی شکست و ریخیت کی مہم جاری کر رکھی ہے ؎

ریزہ ریزہ از سنگ آوینائے او آہ از امروز بے فردائے او

بات بہت دور جا نکلی ہے، مقصد یہ تھا کہ دعوت کے دورِ اول میں جو لوگ قبولِ دعوت کے بعد جماعت میں شامل ہوتے تھے آنحضرت صلعم کامل توجہ سے ان کے دلوں میں اسلامی نصب العین کی لگن پیدا کرتے اور اس مقصد کی راہ میں پیش آنے والے آلام و مصائب پر صبر و ضبط کی تلقین فرماتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے مکی دور میں جس قدر قرآنی سورتیں نازل ہوئیں ان میں صرف اسلام کے اعتقادی مسائل سے بحث کی گئی ہے اور اس کے ساتھ بار بار مسلمانوں کو عفو و بردباری اور تحملِ شدائد کی ہدایت کی گئی ہے۔

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ (آیہ)	اے پیغمبر! آپ نیکی کے ذریعہ (برائی کی) مدافعت کریں
فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰہُ بِاَمْرِہٖ ۔ (آیہ)	پس تم معاف کرو اور پہلوتہی کرو، یہاں تک کہ اللہ کوئی حکم دے۔
وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۔ (آیہ)	جو صبر کرے اور معاف کرے پس یہ عزم الامور سے ہے۔
وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَھُوَ خَیْرٌ لِّلصّٰبِرِیْنَ (آیہ)	اور اگر تم صبر کرو گے تو یہ صبر کرنے والوں کے لیے بہت بہتر ہے۔

اس قسم کی بہت سی آیات ہیں جن میں مسلمانوں کو عفو و درگذر اور مصائب پر صبر و استقامت کا حکم دیا گیا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ ان احکام کی حیثیت مستقل پالیسی کی نہ تھی بلکہ دعوت کے مرحلۂ اول پر مسلمانوں کے لیے صبر و تحمل کے سوا کوئی چارہ ہی نہ تھا، کیونکہ ایک تو مسلمانوں کی تعداد آٹے میں نمک کے

برابر تھی اور دوسرے سامان کا کوئی تنظیمی مرکز نہ تھا۔ اور درحقیقت ان آیات میں دعوت کے مرحلۂ اوّل کے لیے یہ اصول متعین کردیا گیا ہے کہ جب بھی داعیانِ حق کو ان حالات میں اقامتِ دین کا فریضہ انجام دینا پڑے تو قوت و طاقت فراہم ہونے تک، وہ دشمن کی زیادتیوں کو برداشت کریں اور ان کے مقابلہ میں ہاتھ نہ اٹھائیں، اور ظاہر ہے کہ دعوت و اقامتِ دین کا فریضہ اس عہد کے لیے ہی مخصوص نہ تھا بلکہ تاقیامت جاری رہنے والا ہے، لیکن ہمارے بیشتر مفسرین نے حد ہی کردی ہے کہ انہوں نے جہاد کی آیاتِ مطلقہ سے ان تمام آیات کو منسوخ قرار دے دیا ہے جن میں عفو و درگذر کا حکم دیا گیا ہے یا جن میں مشروط طور پر جہاد و قتال کی اجازت دی گئی ہے۔ ان حضرات نے نہ جانے کیسے یہ تصور کرلیا ہے کہ تحریکِ دعوت و اقامتِ دین کے لیے اس قسم کے حالات قیامت تک پیش ہی نہ آئیں گے؟

بات یہ ہے کہ داعیانِ حق کو دعوت کے ابتدائی مرحلہ سے لے کر انتہائی مرحلہ تک مختلف حالات سے سابقہ پڑتا ہے اور یہ ضروری نہیں کہ جو پالیسی دعوت کے ابتدائی مرحلہ کے لیے موزوں ہو وہ بعد کے ادوار کے لیے بھی کارآمد ہوسکے۔ لیکن جب کسی زمانہ میں از سرِ نو ویسے ہی حالات درپیش ہوں جو دعوت کے ابتدائی مرحلہ پر پیش آتے ہیں تو اس وقت ان قرآنی آیات ہی سے روشنی لی جاسکتی ہے جن کو ہمارے مفسرین نے منسوخ قرار دے دیا ہے[1]۔

یہ جو کہا گیا ہے کہ قرآن حکیم نے دعوت کے ابتدائی مرحلہ کے لیے عفو و صبر کو بطور ایک اصول کے پیش کیا ہے رسولِ عربی صلعم اور آپ کی امت ہی سے مخصوص نہیں، بلکہ آپ سے پہلے کے انبیاء و رسل بھی اس اصول کی پابندی کرتے رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ واضح مثال حضرت مسیح علیہ السلام کی ہے۔ چونکہ حضرت مسیح کو بھی ایسے ہی حالات سے سابقہ پڑا تھا کہ ایک طرف رومیوں کی ظالمانہ حکومت تھی اور دوسری طرف یہود کے فتنہ پرور پیشوایانِ مذہب! اس لیے انہوں نے اپنے پیروؤں کو یہ تعلیم دی تھی:-

---

[1] میں نے اپنی کتاب "اسلام کا نظریۂ جہاد" میں اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کی ہے۔

"جو کوئی تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے، دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دے۔ اگر کوئی نالش کر کے تیرا کرتہ لینا چاہے تو چوغہ بھی اُس کے حوالے کر دے" (متی ۵: ۳۹-۴۰)

لیکن حضرت مسیح کے بعد میں آنے والے پیروؤں نے یہ سمجھ لیا کہ عدمِ تشدد حضرت مسیح کا مستقل عقیدہ و مسلک اور دینِ مسیحی کا جزوِ اعظم ہے اور ان کے اتباع میں مسلمانوں کا سوادِ اعظم بھی اسی غلطی میں مبتلا ہو گیا۔ حالانکہ بات بالکل سیدھی اور صاف تھی کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے جن حالات میں دعوتِ اقامتِ دین کا بیڑہ اٹھایا تھا ان میں وہ اس سے زیادہ کر ہی کیا سکتے تھے؟ اگر حضرت مسیح کو کام کرنے کا موقع ملتا اور ان کو دعوت کے ابتدائی مرحلہ سے آگے نکلنا نصیب ہوتا تو یقیناً وہ اپنے بلند نصب العین کے لیے تلوار بھی اٹھاتے۔ چنانچہ حضرت مسیح کے اقوال ہی سے اس کا ثبوت ملتا ہے:-

"یہ نہ سمجھو کہ میں صلح کرانے آیا ہوں، صلح کرانے نہیں آیا بلکہ تلوار چلانے آیا ہوں" (متی ۱۰: ۳۴)

دورِ اول میں آنحضرت کا دعوتی لائحہ عمل | یہ تو واضح ہو چکا ہے کہ کارِ نبوت کا حقیقی منشا پوری انسانی زندگی کی شیرازہ بندی ہے یعنی ایک نئے نظامِ فکر اور جدید فلسفۂ حیات کی بنیادوں پر ایک نئے نظامِ سیاست و تمدن کی عمارت اٹھانا اور اس کے مختلف اجزاء میں نظم و ترتیب پیدا کرنا ہے۔ لیکن اس مقصد کے حصول کا یہ طریقہ سراسر غلط ہے کہ فسادِ انسانیت کے اصل سرچشمہ کو جوں کا توں رہنے دیا جائے اور مختلف سمتوں کو بہنے والی نالیوں کے آگے بند باندھنا شروع کر دیا جائے یا فکر و عمل کے شجرۂ خبیثہ کی جڑ ولوں کی زمین میں بدستور گڑی رہے اور اس کی شاخوں کی قطع و برید شروع کر دی جائے۔ یہ راہِ عمل آج تک کبھی صحت مند اور کارآمد نتائج نہیں پیدا کر سکی اور نہ کر سکتی ہے۔ صحیح اور معقول طریقہ تو یہ ہے کہ اصل منبعِ فساد کو روکا جائے اور مرضِ انسانیت کے حقیقی سبب کی ٹوہ لگائی جائے جس سے نت نئے عوارض رونما ہوتے ہیں۔

دراصل یہ منبعِ فساد جس سے تمام شخصی اور اجتماعی مفاسد پھوٹ پھوٹ کر نکلتے ہیں انسان

کا حدودِ بندگی سے تجاوز کرنا اور ذاتِ خداوندی کی شانِ کبریائی اور منصبِ اقتدارِ اعلیٰ میں شریک و سہیم بننا یا بنانا ہے۔ مقامِ بندگی اور مقامِ کبریائی کے حدود و اختیارات کو اگر اپنی اپنی جگہ رہنے دیا جائے تو حیاتِ انسانی کے کسی شعبہ میں بگاڑ پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ معبودیت و الوہیت، حاکمیتِ اعلیٰ، منصبِ قانون سازی، حاجت روائی، قدرتِ مطلقہ وغیرہ ذاتِ خداوندی کے مختص مقامات ہیں، اور بندہ کا مقام ذاتِ خداوندی کی خالص بندگی اور غیر مشروط اطاعت کرنا ہے اور بس! یعنی ایک تو عبادت و بندگی ایک ہی ذات کے لیے مخصوص ہو اور اس میں کسی دوسرے کو شریک نہ بنایا جائے اور دوسرے اطاعت بھی اسی کی ہو جس کی بندگی کی جاتی ہے۔ یہ بات سراسر غیر معقول ہے کہ بندگی ایک کی ہو اور اطاعت دوسرے کی!

إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللَّهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّينَ أَلَا لِلَّهِ الدِّينُ الْخَالِصُ (سورۂ زمر)	ہم نے آپ کی طرف کتاب اتاری ہے حق کے ساتھ پس آپ اللہ کی عبادت کریں اپنی اطاعت کو اسی کے لیے خالص کر کے۔ یاد رکھو اطاعت خالص اللہ ہی کے لیے ہونی چاہیے۔
قُلْ إِنِّي أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ اللَّهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّينَ۔ (زمر)	اے پیغمبر! آپ کہہ دیں کہ مجھے یہ حکم ملا ہے کہ میں اللہ کی عبادت کروں دین (اطاعت) کو اس کے لیے خالص کر کے۔

یہ ثنویت (عبادت اور اطاعت کو الگ الگ کر دینا) درحقیقت منصبِ آدمیت اور مقامِ بندگی کی شکست و ریخت ہے اور اس سے ہرگز بہتر نتائج نہیں پیدا ہو سکتے۔ اس لیے دنیا میں صرف وہی اصلاحی یا انقلابی جدوجہد کامیاب ہو سکتی ہے جو اس منبعِ فساد سے آغازِ جنگ کرے۔ اور اسی لیے پیغمبرانہ دعوت ہمیشہ لاالٰہ الا اللہ کے انقلابی نعرہ سے کام کی ابتدا کرتی ہے، لیکن یہ نعرہ یونہی بے مغز اور کھوکھلا نعرہ نہیں ہے بلکہ ان تمام اصول و مقاصد کی جان ہے جو اسلامی نصب العین کے لیے مطلوب ہیں اور جو شخص قلبی احساس اور دماغی بصیرت کے ساتھ اس کا

اقرار کرتا ہے۔ اس کی زندگی کا نقطۂ نظر، اس کی اخلاقی قدریں، اس کی معاشرت، اس کی معیشت و سیاست، اس کے بین الملّی روابط، اس کی تہذیب و ثقافت، غرض اس کی پوری زندگی ایک نئی سمت کو پھر جاتی ہے۔

در جہاں آغازِ کار از حرفِ لا است　　این نخستین منزلِ مردِ خدا است

ملتے کز سوزِ او یک دم تپید　　از گلِ خود خویش را باز آفرید

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی دعوت کے دورِ اوّل میں اسی نقطہ سے کام کی ابتدا فرمائی۔ تنظیم کے لیے یہ ضروری قرار دیا گیا کہ جو شخص لا الٰہ الا اللہ کے اقرار کے ساتھ جماعت میں داخل ہو وہ تمام سابقہ عقائد و افکار اور اعمال و اشغال سے یکسر کنارہ کش ہو جائے ـــ "لا الٰہ" کا مفہوم یہی ہے ـــ اور پھر اپنی پوری زندگی کو خدا اور رسول کے حوالے کر دے ـــ یہ "الا اللہ" کا مفہوم ہے ـــ نیز اس مرحلہ پر یہ بھی ضروری تھا کہ ان لوگوں کے دلوں میں اس مقصد کے لیے صدق و اخلاص اور سوز و عشق پیدا کیا جائے تاکہ وہ خاندانی رشتوں کو چھوڑنے اور راہِ حق میں بڑی بڑی قربانی کے لیے مستعد ہو جائیں۔ نگاہِ نبوت نے یہ کام بھی کر دیا اور ان کے دلوں میں کچھ ایسی سیمابی تڑپ پیدا ہو گئی کہ حرکت و بیقراری ہی ان کی زندگی کا قرار بن گئی۔

موجیم کہ آسودگیٔ ما عدمِ ما است　　ما زندہ از آنیم کہ آرام نگیریم

دورِ نبوت سے پہلے دنیا کی تمام قومیں فکر و عمل کے لحاظ سے روحِ دینی اور ذوقِ حق پرستی سے بالکل محروم تھیں۔ ان کا طرزِ زندگی اور نظامِ تمدن اصولِ دین سے یکسر بے تعلق تھا۔ دین و مذہب معبدوں اور خانقاہوں میں محبوس اور پیشوایانِ مذہب کی ہوسناکیوں کا آلہ کار تھا۔ گو اہلِ حکومت و اقتدار اور ملک کے عوام زبانی طور پر دینداری کے مدعی تھے لیکن ان کے طرزِ بود و باش اور اندازِ فکر و عمل سے یہ اندازہ کرنا قریباً ناممکن تھا کہ وہ فی الواقع خدا اور اس کے دین کو مانتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اس منافقت اور قول و عمل کے تضاد کے خلاف اعلانِ جنگ تھی۔ نیز آپ نے دین کو ایک مکمل نظامِ حیات کی حیثیت سے پیش کیا۔ جو لوگ جماعت میں شامل ہوتے تھے یہ بات ان کے ذہن نشین کر دی جاتی تھی کہ دین جس طرح حیات بعد الممات کے مسائل سے

بحث کرتا ہے اسی طرح وہ انسانی زندگی کے عملی مسائل کو بھی حل کرتا ہے، اور دین کو ماننے کے معنی ہی یہ ہیں کہ اس کو کامل نظامِ حیات کی حیثیت سے تسلیم کیا جائے اور اس کے حصے بخرے نہ کئے جائیں۔

شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِينَ مَا تَدْعُوهُمْ إِلَيْهِ (الشوریٰ)

مقرر کیا اللہ نے تمہارے لیے وہ دین جس کے قائم کرنے کا اس نے نوحؑ کو حکم دیا اور وہ جو وحی کی ہم نے آپ کی طرف اور وہ جو حکم کیا ہم نے اس کے قائم کرنے کا ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو اس مضمون کے ساتھ کہ تم دین کو قائم کرو اور اس میں افتراق پیدا نہ کرو۔ مشرکین پر وہ چیز بہت گراں ہے جس کی طرف آپ ان کو دعوت دیتے ہیں۔

آیت کے آخری ٹکڑے "کبر علی المشرکین ما تدعوھم الیہ" پر غور کیجیے! مشرکین کے لیے کیا چیز مشکل تھی؟ ظاہر ہے کہ "لا الٰہ الا اللہ" کا زبانی اقرار ان کے لیے کچھ بھی مشکل نہ تھا، مشکل کوئی چیز تھی تو وہ یہ کہ اس کے منشا و مقصود کے پیش نظر زندگی کے پورے ڈھانچے کو بدل ڈالیں اور بندگیٔ نفس کو چھوڑ کر اپنی زندگی کی باگ ڈور خدا اور رسول کے ہاتھ میں دے دیں۔ صرف یہی چیز تھی جس نے مشرکین کو دعوتِ نبوی کے بالمقابل کھڑا کر دیا۔

دعوتِ نبوی کا دوسرا دور اس سے پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ مکی دور کے آغاز میں آنحضرت صلعم نے دعوت کا کام کس طرح شروع کیا اور کن کن لوگوں کو سب سے پہلے دعوت سے متعارف کیا۔ تین سال تک اسی انداز سے کام ہوتا رہا۔ لیکن اس کے بعد دعوت کی رفتار اس مرحلہ پر پہنچ گئی کہ آپ کو علانیہ فریضۂ تبلیغ انجام دینے کا حکم ہوا۔

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ (حجر) — آپ کو جو حکم ملا ہے اس کو واشگاف کہہ دیں۔

اور پھر یہ حکم بھی نازل ہوا

وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ (شعراء) — آپ اپنے قریبی خاندان والوں کو اللہ کے عذاب سے ڈرائیں

لیکن دعوت اسلامی جس قدر زور پکڑتی گئی اسی قدر دشمنوں کی مزاحمت اور مظالم کی شدت بھی بڑھتی گئی، اس حد تک کہ سنہ ۵ نبوی میں کچھ مسلمانوں کو جن میں کچھ ذی اثر اور متمول افراد بھی شامل تھے حبشہ کی طرف ہجرت کرنی پڑی۔ سنہ ۶ نبوی میں حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ نے اسلام قبول کیا۔ اب تک مسلمانوں کی تعداد چالیس پچاس کے لگ بھگ تھی، لیکن اب مسلمانوں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہونے لگا اور مشرکین کو یہ خوف دامنگیر ہوا کہ اگر اسلام کی رفتار ترقی کا یہی حال رہا تو یہ کچھ دنوں میں سارے عرب پر چھا جائے گا۔ چنانچہ دعوت و تبلیغ کا دوسرا دور شروع ہونے پر مخالفین کے مظالم کا بھی نیا دور شروع ہو گیا۔ کفار نے مشورہ کے بعد حضور کے چچا ابوطالب سے مطالبہ کیا کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم، کو قتل کے لیے ہمارے حوالے کر دیں اور بصورت انکار بنی ہاشم سے مکمل بائیکاٹ کر دیا جائے گا۔ پہلی صورت کے لیے ابوطالب تیار نہ ہوئے اس لیے دوسری صورت ہی کو قبول کرنا پڑا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، ابوطالب، دیگر افراد بنی ہاشم اور گروہ مومنین کو شعب ابی طالب میں محصور ہونا پڑا۔ کفار نے اشیاء خورد و نوش کی بہم رسانی پر پہرے بٹھا دیے اور ان ناکردہ گناہ مسلمانوں نے مسلسل تین سال درختوں کے پتے اور خشک چمڑے کھا کر وقت کاٹا۔ تین سال کے بعد یعنی سنہ ۱۰ نبوی میں کچھ نیک دل لوگوں (ہشام عامری اور زہیر) کی سعی و کوشش سے مسلمانوں کو اس مصیبت سے رہائی ملی۔ لیکن اسی سال آنحضرت صلعم اپنے شفیق چچا کے سایۂ عاطفت اور اپنی زوجہ خدیجۃ الکبریٰ کی رفاقت سے محروم ہو گئے۔ ابوطالب کی موت ایک بہت بڑا سانحہ تھی اور شاید ظاہر بیں لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہو گا کہ اب اسلام اور بانیٔ اسلام کا آخری سہارا بھی جاتا رہا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ دعوتِ حق کا کام شخصیتوں کی موت و حیات پر انحصار نہیں رکھتا، جس کا یہ کام ہے اس کے پاس سہاروں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ اور اگر کوئی سہارا نہ بھی ہو تو بغیر سہارے کے بھی وہ اس کام کو چلا سکتا ہے چنانچہ یہ بات دنیا کے لیے یقیناً تعجب انگیز ہو گی کہ اس سال سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حلقۂ دعوت کو پہلے سے زیادہ وسیع کر دیا۔ قرب و جوار کی بستیوں میں جا کر لوگوں کو

دعوتِ حقہ سے روشناس کیا اور حج کے موقع پر عرب کے مختلف قبائل کے اعاظم و رؤسا سے ملاقاتیں کیں۔ ابن سعد کی تصریح کے مطابق اس دوران میں آپ تقریباً پندرہ قبائل سے ملے، اور ان کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی۔ ان قبائل میں بنو عامر، غسان، حنیفہ، سلیم، بنو نصر، کندہ، عذرہ، حزارہ اور بنو ذہل بن شیبان قابلِ ذکر ہیں۔ نیز آپ عکاظ، مجنہ، ذوالمجاز کے میلوں میں تشریف لے جاتے اور لوگوں کو حق کی دعوت دیتے تھے۔ مورخین کی تصریحات کے مطابق عکاظ نامی میلہ عربوں میں بہت اہمیت رکھتا تھا۔ اس میں ہر قبیلہ کے لوگ اپنے جنگی کارنامے اور نسلی مفاخر بیان کرتے تھے، اور بڑے بڑے نامور شعراء اس میں شریک ہوتے تھے، گویا یہ ایک "بین القبائلی ادبی ادارہ" تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دورۂ قبائل کے دوران میں جب قبیلۂ بنو عامر کے پاس تشریف لے گئے تو اس قبیلہ کے فراس نامی ایک جاہ پرست لیڈر نے آپ کی تقریر سُن کر کہا "یہ شخص میرا ساتھ دے تو میں پورے عرب کو زیرنگیں کر لوں" نیز اس نے کہا "میں اس شرط پر آپ کا ساتھ دیتا ہوں کہ آپ اگر مخالفوں پر غالب آجائیں تو آپ کے بعد حکومت و ریاست مجھے ملے گی"۔ آنحضرت صلعم نے فرمایا "یہ تو میرے بس کی بات نہیں: یہ خدا کا کام ہے وہ جس کو چاہے دے"۔ اس پر اُس نے کہا "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم پورے عرب کی دشمنی مول لیں اور حکومت میں ہمیں کوئی حصہ نہ ملے" (طبری)

اس قسم کا ایک واقعہ دعوتِ نبوی کے تیسرے دَور میں بھی پیش آیا۔ صلح حدیبیہ کے بعد ۶ھ کے آخر یا ۷ھ کے اوائل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ملوک و سلاطین اور رؤسائے قبائل کو جو دعوتی خطوط لکھے تھے ان میں ایک خط ہوذہ بن علی رئیس یمامہ کے نام بھی تھا، اس شخص نے جواب میں لکھا "آپ نے جو باتیں لکھی ہیں وہ بڑی اچھی ہیں۔ اگر حکومت میں آپ مجھے بھی شریک بنانے کے لیے تیار ہوں تو میں آپ کا ساتھ دے سکتا ہوں" لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا "زمین کا ایک ٹکڑا بھی ہو تو نہیں دیا جا سکتا" (ابن ہشام)

بات یہ ہے کہ اسلام کسی فرد یا جماعت کو حکومت و اقتدار کا حق محض اس نظریہ کی بنا پر نہیں دیتا کہ جو حریت و آزادی کی جدوجہد میں ایثار و قربانی کرے وہی حکومت و سیادت کا اہل تصور کیا جائے۔ اسلام کے نزدیک حکومت و سیادت کی اولین شرط صالحیت ہے۔ یہ شرط جس میں موجود ہو وہی حکومت و امارت کا اہل ہے، لیکن اس کے ساتھ ایثار و قربانی بھی مل جائے تو اس سے استحقاق کو مزید تقویت حاصل ہوتی ہے، نیز ان واقعات سے یہ بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ جو شخص اقتدار کی خواہش لیے ہوئے اسلام میں داخل ہو یا اقتدار کے لیے اقامتِ دین کی جدوجہد میں حصہ لے، اسلام کی نظر میں اس کے اسلام اور ایثار و قربانی کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔

یہ جو کچھ کہا گیا ہے مذکورہ بالا واقعات کے ضمن میں ضمنی طور پر آگیا ہے ورنہ یہ کوئی ایسی بات نہیں جس سے اہلِ علم نا آشنا ہوں۔ جو بات نصوصِ قطعیہ سے ثابت ہو اس کے لیے کسی دوسری چیز کا سہارا لینے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ قرآنِ حکیم نے اسلامی جدوجہد کا مقصد واضح الفاظ میں متعین کر دیا ہے۔ اور اس جدوجہد کے بعد اگر زمین کے کسی ٹکڑے میں حکومتِ اسلامی قائم کرنے کی نوبت آئے تو امارت و سیادت کے اہل وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو اسلامی تصریحات سے قلبی عقیدت اور عملی لگاؤ رکھتے ہیں۔ اور ان کی زندگیوں سے یہ ظاہر ہو کہ وہ فی الواقع اس تصورِ زندگی کو ماننے والے ہیں محض زبانی دعویٰ اس مقصد کے لیے ہرگز کافی نہیں ہے۔

غرض دعوت کے پہلے دور کی نسبت سے دوسرے دور میں جن امور کا اضافہ ہوا وہ یہ ہیں:-

(۱) دعوت کا کام پہلے رازداری سے ہوتا تھا اور اب علانیہ شروع ہو گیا۔

(۲) پہلے تبلیغ و دعوت کی نوعیت انفرادی تھی اور اب اس نے اجتماعی اور عوامی رنگ اختیار کر لیا۔

(۳) تحریک کی عمومیت کے پیشِ نظر ان مسائل سے تفصیلی بحث کی گئی جو دینِ ابراہیمی اور یہود و نصاریٰ کے مذاہب میں بنیادی حیثیت رکھتے تھے، لیکن ان مذاہب کے پیروؤں نے ان

کی نوعیت بالکل بدل دی تھی۔ان مسائل کو نئے نئے اسالیب بیان اور فطری طرزِ استدلال سے ثابت کیا گیا۔

مکی دَور کی یہ خصوصیت ہے کہ اِس میں جو لوگ حلقہ بگوش اسلام ہوئے ان کے دل ہر قسم کی دنیاوی آلائشوں سے پاک تھے اور وہ حق کو حق سمجھ کر اسلام میں داخل ہوئے تھے کیونکہ اِس زمانہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دینا گویا موت کو دعوت دینا تھا۔یہ لوگ ابتلاء و آزمائش کی بھٹی میں پڑ کر نکھر چکے تھے اور اس لیے ان کی ایمانی طاقت کا یہ حال تھا کہ ایک مسلمان دس کافروں پر بھاری تھا۔

اِنْ یَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ۔ (انفال-۹)	اگر تم میں بیس صبر کرنے والے آدمی ہوں تو وہ دو سو کافروں پر غالب آئیں گے۔

اِن لوگوں کی تیز بیں اور حقیقت شناس نگاہ نے اسلامی اصول و تصورات کے ذہنی نقشہ کی مدد سے مستقبل کا عملی نقشہ مشاہدہ کر لیا تھا لیکن جو لوگ دعوت کے تیسرے دَور یعنی تاسیسِ مملکت اور نظامِ اسلام کے قیام و نفاذ کے بعد مسلمان ہوئے ان کے سامنے اسلام کا عملی نقشہ آچکا تھا اور اِس سے پہلے ان کی نگاہ اسلام کے درخشاں مستقبل کو نہ دیکھ سکی تھی۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان دونوں کے علم و عمل میں کتنا عظیم فرق تھا؟یہی وجہ ہے کہ تیسرے دَور میں مسلم اور کافر کا تناسب" ایک اور دس" سے اتر کر" ایک اور دو" رہ گیا تھا۔

اَلْئٰنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ (الانفال)	اب اللہ تعالیٰ نے تم پر تخفیف کر دی ہے اور اللہ نے جان لیا ہے کہ تم میں اندر کمزوری ہے،پس اگر تم میں ایک سو صبر کرنے والے مسلمان ہوں تو وہ دو سو کافروں پر غالب آئیں گے۔

دوسرے دَور میں چونکہ دعوت نے عوامی رنگ اختیار کر لیا تھا اس لیے مکی دَور کے اواخر تک اسلام کی آواز دُور دُور تک پھیل چکی تھی،اور کم از کم اس نئی تحریک کے نام سے عرب کے تمام قبائل

(جن میں جنوبی عرب اور شمالی عرب کے قبائل بھی شامل تھے) روشناس ہو چکے تھے۔ حبشہ، مسلم مہاجرین کے ورود کی وجہ سے اسلام کے نام سے متعارف ہو چکا تھا۔ مدینہ منورہ میں مصعب بن عمیرؓ کی تبلیغ سے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد پیدا ہو چکی تھی۔

دعوت کا تیسرا دور یہ دور ہجرت کے بعد شروع ہوا، جبکہ مدینہ منورہ میں اسلامی اسٹیٹ قائم ہوا، ذہنی تصورات پیکرِ مشہود بن کر جلوہ گر ہوئے، عملی سیاسیات سے واسطہ پڑا، معاشی خاکہ بندی کی اسکیمیں مرتب ہوئیں، معاشرت کے اصول وضع ہوئے، پہلی مملکتِ اسلامیہ کا دستور ترتیب دیا گیا، بین الممالک پالیٹکس کے نقشے تیار ہوئے، عدالت کا آئین وضع ہوا، غرض نظامِ کہنہ کا ہر نقش مٹا دیا گیا اور ایک ہمہ گیر اور مکمل نظامِ سیاست و تمدن سے دنیا کو روشناس کیا گیا۔

سوختی لات و منات کہنہ را تازہ کردی کائنات کہنہ را

یہ سب کچھ دیکھ کر دنیا حیران و ششدر رہ گئی کہ جس کو کل تک دیوانہ تصور کیا جاتا تھا اور اس کی قوم نے اس کو گھر سے بے گھر کر دیا تھا آج صرف عرب ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کی مرکزی طاقت اس کے ہاتھ میں آگئی ہے اور اقوامِ دنیا کی قسمتوں کا مالک بن گیا ہے؛

تیسرے دور میں تاسیسِ مملکتِ اسلام، آنحضرت صلعم کی سیاست کاری، معاشی خاکہ بندی، نظامِ عدالت وغیرہ مستقل مباحث ہیں اور ہر ایک کو انشاء اللہ الگ الگ عنوان کے ضمن میں زیرِ بحث لایا جائے گا۔ وباللہ التوفیق۔